کی سمجھ خاطر خواہ ہو تو فیل ہونا ناممکن ہے۔"

"جی ہاں . . . ایسا ہی ہے۔"

"یہ کتاب پڑھ کر رائے ضرور دینا، بلکہ نوٹس بنا لینا اپنے لئے۔"

"ہاں جی . . اچھی بات ہے۔"

جب وہ ابا جی سے مل کر اپنے کمرے میں پہنچا تو وہ اپنے اندر ڈھول سا کھوکھلا پن محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دنیا کے عظیم ترین مذہبوں کی خوبصورت کتاب تھی۔ یہ کتاب پکڑے ہوئے اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ نیچے سڑک پر نیلی سیاہ کاریں آجا رہی تھیں، اس نے جی میں سوچا میں ابا جی کی خاطر اس کھڑکی سے کود سکتا ہوں، بکسلے کے ناول پڑھ سکتا ہوں، ان کے لئے جان دے سکتا ہوں، لیکن دوستی . . توبہ! توبہ! ابا جی سے دوستی کسی قیمت پر نہیں کر سکتا۔ اکیلا میں کیا کوئی بھی تو نہیں کر سکتا۔

دوستی تو غازہ لگے لاہور اور رشیدہ میں ہو رہی تھی۔ شام کے وقت مال پر روشن ڈے لائٹ بتیاں، دور رویہ کھڑے چھتنار بے درخت جنگی پنڈلیوں تک سفیدی کی کوچی پھیری تھی، دوکانوں کے جگمگاتے بورڈ، دوکانوں کے باہر کھڑی کاریں، ان کاروں میں سے نکلتی ہوئی ماڈرن لڑکیاں، جو فرانسیسی انداز دلکشی کی خاطر خواہ پیروی کر رہی تھیں، لڑکیوں سے پرے سینما گھر، سینما گھروں کی بغل میں ریڈیو بجاتے ہوٹل یہ سب کچھ شو کے لئے بہت دلآویز تھا۔

کالج میں وہ دو شخصیتوں سے بری طرح متاثر ہو چکی تھی۔ ایک تو ڈاکٹر اعجاز حسین اور دوسرے ڈمپل ۔۔۔ ڈمپل سے گو اس کی دوستی نہ ہو سکی لیکن وہ ڈمپل کو ہمیشہ منہ کھول کر دیکھتی رہتی تھی۔ ڈمپل میں آرٹ پیپر جیسی چکنائی۔ اور مرائی اوٹلے جیسا رومان بھرا تھا۔ رشو اندر ہی اندر ڈمپل کی انگلی سے رسّی کی طرح لپٹی جا رہی تھی۔

پروفیسر اعجاز کی بات ذرا مختلف تھی۔

انہیں دیکھ کر رشو کو آباجی یاد آتے تھے۔ آباجی کی کنپٹیوں پر بھی اسی طرح سفید بالوں نے یورش کر رکھی تھی۔ وہ پینٹ قمیض تو نہ پہنتے تھے۔ لیکن ان کا ڈھانچہ شلوار قمیض میں اسی قدر رعب دار لگتا تھا۔ بہاول پور دراصل سفید پوشوں کا شہر تھا۔ ۔۔۔ ایسے سفید پوشوں کا جو حصولِ دولت کی خاطر بہاول پور چھوڑ جانا چاہتے تھے لیکن جنہیں بہاول پور کی مٹی، اس کی گلیاں، اس کی تہذیب گھر سے باہر جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے جب بہاولپور سے دلی کو راستہ جاتا تھا۔ تب بہاولپور ایک پُر بہار شہر تھا۔ پھولوں سے لدی ڈولی کی طرح پُرکشش اور شگفتہ۔ لیکن اب یہ صرف سفید پوشوں کا شہر تھا۔ جہاں صرف نجابت اور خاندانی شجروں کی باتیں ہوتی تھیں۔ پدرم سلطان بود کے نعرے لگتے تھے۔ اور شہر کے معزز شہری اپنے اپنے گھر پہنچ کر اپنی اپنی عزت کو پگڑی کے ساتھ کھونٹی پر ٹنگا کر اطمینان کا سانس لیتے تھے۔

رشو کے والد بھی سفید پوشش تھے۔ آبائی زمینیں جنہیں ہندوستان سے منسلک نہروں کا آنا جاتا پانی تباہ کر چکا تھا . . . ان سے بمشکل تمام اتنی آمدنی ہوتی تھی کہ سال بھر بڑی کفایت سے گزر اوقات کی جا سکتی، وہ تو اماں کی جز رسی تھی کہ قرض لئے بغیر کام چل رہا تھا۔ ورنہ ابا جی تو نہ جانے کیا کیا سکیمیں بناتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے حال سے اس قدر تنگ آجاتے کہ کویت اور بحرین جانے کا پکا منصوبہ بن جاتا ایسے میں انہیں کھونٹے سے باندھنے والی والدی اماں تھیں جنہیں اپنی کنگروں والی حویلی سے بڑا پرانا پیار تھا۔

ابا جی کی ساری امیدیں زمین پر ٹیوب ویل لگوانے کے بعد رشو کو بی اے بی ٹی کروانے کے ساتھ بندھی تھیں۔ جب وہ ایف اے میں ہوتی تو ابا اسے اپنے ساتھ کھانا کھلانے لگے۔

کھانے کے دوران وہ ساری اچھی اچھی بوٹیاں، روغنی ٹھڈی حلوے میں سے گریاں، ناریل نکال کر اس کی تھالی میں رکھتے جاتے اور کہتے:

"ہماری رشو لڑکی تھوڑی ہے . . . یہ تو لڑکا ہے لڑکا . . . اس کی تو میں شادی کبھی نہیں کرونگا۔ ہماری رشو تو بی اے بی ٹی کرے گی۔ کیوں رشو؟"

"جی اباجی . . ."

"اور پھر ہماری رشو بہاولپور سکول کی ہیڈ مسٹریس بنے گی۔ انسپکٹر آف سکولز بنے گی . . یہ تو ہے میرا دایاں بازو . . . یہ تو ہے ہی میرا بیٹا . . . کیوں رشو؟"

"جی ابا جی۔"

"ابا کو دغا تو نہیں دے گی رشو؟"

"نہیں ابا جی۔"

"شاباش میرا بیٹا! جب تو پیدا ہونے والی تھی تو میں تیری ماں سے کہا کرتا تھا۔ سن بھاگ بھری، ہم ریاستی لوگوں کے ہاں ہمیشہ پہلوٹھی کا بیٹا ہوا کرتا ہے۔ میں اس کا نام یا تو شمشیر علی رکھوں گا یا ضیغم پرویز۔۔۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں بچی سے۔" اماں کہتیں۔

"باپ بیٹا بات کرتے ہوں تو تو بیچ میں نہ بولا کر۔۔۔ ہاں۔۔۔ پھر تو پیدا ہوئی تو میں نے تیری ماں سے کہا۔۔۔ یہ دراصل بیٹا ہی ہے۔ وہ رب سائیں مجھے آزما رہا ہے۔ میرے صبر کو آزما رہا ہے۔ میں نے تیرا نام اشرف النساء رکھا تھا۔ خدا جانے تیری ماں نے اسے رشیدہ میں کیوں بدل دیا۔"

"اچھا اچھا! لقمہ بھی تو توڑ دیجئے۔" اماں خفگی سے کہتیں۔

"ہم اپنی اشرف النساء کی شادی نہیں کریں گے۔ شادی میں کیا دھرا ہے۔۔ ہمارا بیٹا تو افسر بنے گا افسر۔۔۔ دورے پر جایا کرے گا۔ چپراسی اس کی چق کے سامنے سٹول پر بیٹھا کریں گے۔۔۔ دغا تو نہیں دے گا، رشو بیٹا ہیں؟"

"نہیں ابا جی"

بی اے تک رشو کے رزلٹ دیکھ کر کسی کو وہم بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ دغا دینے

کا ارادہ بھی رکھتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ بی اے کا رزلٹ نکلے ابھی تین ماہ ہوئے
کہ اچانک ایک دن اباجی بیٹھے بٹھائے دغا دے گئے۔ دادی اماں کو اپنے بیٹے
کی بے وفائی پر اس قدر غصّہ چڑھا کر عین اباجی کے چالیسویں پر جب سارے گھر سے
اگربتیوں کی خوشبو، اور کھجوروں کی گٹھلیوں کی ٹکاٹک سنائی دے رہی تھی، دادی ماں نے
اپنا رختِ سفر باندھا، اور بیٹے کی گوشمالی کرنے سیدھی اگلے جہاں پہنچیں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین میں نجانے کیا بات تھی کہ رشتو کو بھولے ہوتے اباجی بری طرح یاد
آنے لگے۔ ادھر خالہ کے گھر میں اس کی باتیں سننے کو کس کے پاس وقت تھا۔ جب دل بہت
بھر آتا تو وہ ٹرنک میں سے اپنی ڈائری نکالتی، اور اپنی خوبصورت لکھائی میں لکھنے لگتی۔۔
۔۔۔ یہ ڈائری اس کی سب سے بڑی دوست تھی، سب سے پیاری رفیق۔۔

بائیس نومبر:

آج نومبر کی بائیس تاریخ ہے۔ لاہور میں مجھے آتے مہینہ بھر ہو چکا ہے۔ لیکن مجھے
یوں احساس ہوتا ہے جیسے صدیوں سے یہاں ہوں۔ جیسے میں یہاں سے کبھی باہر گئی ہی
نہیں۔ اماں کو خط لکھتی ہوں تو وہ ساری باتیں لکھنے پر دل مائل نہیں ہوتا جو یہاں ہوتی ہیں
کچھ اس لئے نہیں کہ میں ان سے کچھ چھپا رہی ہوں فقط اس خیال سے کہ وہ جس ماحول میں
رہتی ہیں وہاں ان باتوں کو سمجھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اور اسی لئے وہ میری باتیں
سمجھ نہ پائیں گی۔

اور تو اور خود خالہ فیروزہ کے گھر کا نقشہ اگر میں ان سے ہوبہو بیان کروں تو وہ کہیں

گی کہ ابھی بہاولپور واپس چلی آؤ۔ اور سچی بات یہ ہے کہ بہاولپور والوں میں سب کچھ ہے لیکن وسعتِ نظر نہیں ہے۔ خدا قسم ذرہ بھر وسعتِ نظر نہیں۔ پورے کنویں کے مینڈک۔ وہ بھلا کیا سمجھیں گے کہ لاہور درّہ خیبر اور رتی کی درمیانی کڑی ہے۔ اور درمیانی کڑی ہمیشہ زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔

میں آپا کو کیا لکھوں اور کیونکر لکھوں کہ خالہ کا گھر روشن خیال گھر ہے۔ یہاں تنویر اپنے کالج سائیکل پر جاتی ہے۔ اس کے بال کٹے ہوئے ہیں۔ وہ . . . . اور یہاں خالو کے دوست کئی انکل بلا تکلف آتے ہیں۔ اور پہروں رہتے ہیں۔ توبہ! توبہ! آپا سمجھنے کی کوشش بھی نہ کریں گی کبھی۔

لیکن یہ انکل لوگ ہیں کیا بلا؟ . . . سچ مچ!

رشو جان ابھی ڈائری لکھ رہی تھی کہ انوری بلا دستک دیئے اندر آگئی۔ رشو نے جلدی سے ڈائری بند کر دی

"آپا جی . . ."

"کیا ہے انوری؟"

اب اسے انوری سے اس قدر وحشت نہ رہی تھی۔

"پڑھ رہی ہیں آپ؟"

"نہیں تو . . ."

"لکھ تو رہی ہیں"

"یہ تو ایسے ہی ہے ایک . ." رشیدہ نے ڈائری بند کر کے انوری کی جانب دیکھا۔ انوری جیسے کچھ چھپا رہی تھی

"وہ آپا جی ایک کارڈ لکھوانا تھا آپ سے"

"کسے کارڈ لکھوانا ہے؟"

"اپنے ابے کو خط لکھنا ہے آپا جی" وہ چپڑ الالکو جیسے ہونٹ آپس میں ملا کر بولی۔

"لکھواؤ . . . کیا لکھوانا ہے۔ کارڈ ہے تمہارے پاس؟"

سینے پر دو بڑے کٹے ہوئے شلوں کے پلّو میں سے انوری نے کارڈ نکال کر میز پر دھر دیا۔

"آپا جی وہ بات یہ ہے . . . وہ میرا ابا آیا تھا جھراں سے۔"

"اچھا . ."

"ہم . . . وہ . . . ابا میرا . . ."

رشیدہ نے محسوس کیا کہ انوری کچھ بتانے اور چھپانے کے درمیان لٹکی ہوئی ہے۔ اس نے انوری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹھ جاؤ ناں . . . اور اچھی طرح بتاؤ کیا لکھنا ہے گھر۔"

انوری ٹانگیں لٹکا کر اس کھڑکی کی سِل میں بیٹھ گئی، جہاں سے آنگن نظر آتا تھا۔

"وہ آپا میرا ابا تو سودائی ہے۔"

مکار ڈسپیر پر لکھا ہے۔" کھلکھلا کر ہنس دی۔

"نہیں جی! لکھنا تو یہ ہے۔۔۔ آپ اپنی طرف سے لکھ دیں کہ ابھی بیگم صاحبہ چھ مہینے اور مجھے چھٹی نہیں دیں گی کسی قیمت پر۔۔۔ ہاں۔"

یک دم رشیدہ نے پوچھا "تو کیوں خالہ تمہیں چھٹی دے رہی ہیں کیا؟"

"نہیں جی وہ ابا آیا تھا میرا۔۔۔ بیگم صاحبہ کے پاس۔۔"

ابا پر آکر وہ رک گئی۔

"تم صاف صاف کچھ بتاؤ تو لکھوں۔"

انوری نے آنگن کی جانب منہ پھیر لیا۔ اسکی آنکھوں میں نیل کنٹھ کے پروں جیسا نیل اتر آیا تھا۔

"ابا میری شادی کرنا چاہتا ہے جھبراں میں۔"

"شادی؟"۔۔ وہ تو خیر ہو ہی جایا کرتی ہے۔" رشیدہ بولی۔

"وہ جی لڑکا مزارعہ ہے۔ کھیتی باڑی کرتا ہے۔ رہٹ پر دیسی صابن سے نہاتا ہے۔ گلے میں اس کے تعویز لٹکے ہیں، سر پہ مکھن لگاتا ہے۔ پاؤں میں نری کی جوتی پہنتا ہے۔ پورا گنوار ہے۔ گنوار! میں اسے کیا کروں گی۔"

رشیدہ جان نے پہلی بار مڑ کر انوری کو اصلی روپ میں دیکھا۔

یہ لڑکی تیل کے چولہے پر روٹی پکاتی تھی۔ پنکھے تلے سوتی تھی۔ فرج میں سے برف کی ٹکڑیاں نکال کر ٹھنڈا پانی پیتی تھی۔ ریڈیو سنتی تھی۔ فلم دیکھی تھی۔۔۔ اس کا

لباس چاہے پرانا اور مسکا ہوا تھا۔ لیکن جسم سے لپٹا جاتا تھا۔ اس کے کھونسطے ہیلوں والے تھے۔ اور ان ہیلوں والے جوتوں کے اندر اس کے پیروں پر تنویر باجی کی کیوٹیکس لگی تھی۔

اللہ یہ لڑکی کس کے ماتھے جا لگی؟ اونچے گھرانوں میں نوکرانی بن کر رہنا ایسے ہی تھا جیسے کتے کو مونے اپنے پیروں کی ازن دیکر کہا ہو لے آزاد دیکھ، ان کو لگاتے ہی تیری زندگی بدل جائے گی۔ . . . اونچے گھر کی یہ ملازمہ . . . یہ مور کے پنکھ سجائے ہوئے کوا کس منڈیر پر بیٹھ کر ہڈی چبائے گا؟

"آپ لکھ دیجئے جی . . . کہ بعد خیریت احوال کے واضح ہو کہ میں یہاں پر خیریت سے ہوں۔ ابھی چھ مہینے تک تو بیگم صاحب چھٹی نہیں دیں گی اس کے بعد آپ آکر لے جائیے تنخواہ کا منی آرڈر آپ کو ملتا رہے گا۔ ہر مہینے . . . ٹھیک ہے نا آپا جی؟ . . ."

رشو نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"لکھ لیا جی . . ." تھوڑی دیر بعد انوری نے سوال کیا

"ہاں . . . اب پتہ بتاؤ؟"

"چھبراں۔ ڈاکخانہ خاص . . . ضلع شیخوپورہ . . . محمد حنیف کھوکھر کے پاس جاوے جی ڈاکخانہ خاص . . ."

پوسٹ کارڈ لکھوا کر بڑی احتیاط سے انوری نے پھر اسے دوپٹہ کے پلو میں لپیٹ کر سینے پر ڈال لیا۔

"شکریہ آپا جی۔۔۔"

"کوئی بات نہیں۔"

رمضانی کو آوازیں دیتی انوری وڑنگے مارتی چلی گئی۔ رشیدہ نے لمبی سی سانس لی اور جی میں سوچا۔ کبوتری آنکھیں بند کر کے سوچتی ہے "بلی چلی گئی!۔۔۔ حالانکہ بلی کی مونچھیں اس وقت اس کے پروں سے آدھ انچ کے فاصلے پر ہوتی ہیں۔

کب تک انوری کب تک؟

آنکھیں بند کرنے سے ساری عمر تو نہیں گذر جاتی۔

آنکھیں بند کرنے سے مزارعوں کا رٹا کا جو رہٹ پردیسیا صاحب سے بنتا ہے۔۔ وہ تو پھر بھی دیسی مکھن ہی سر پہ لگائے گا اور زری کی جوتا ہی پہنے گا، آنکھیں بند کرنے سے حاصل؟

انوری کی اس گھر میں جو اہمیت تھی، اس کا اندازہ رشو بہت جلد لگا چکی تھی۔ خالو جمال کے دفتری حالات اور گھریلو امور کے انتظامات میں بڑا فرق تھا

خردمندوں کی حکایاتِ غریب سے نقل ہے کہ ایک عراف پر فن خرمن صبر و شکیبائی کی دشمن کسی دیہات میں بیاہ کر گئی۔ اس بدفطرت زن بدافعال کا طریق یہ تھا کہ حد زیب و زینت سے آراستہ و پیراستہ بالائے بام نظارہ کناں رہتی تھی۔ اور آتے جاتے و ہقانیوں سے ہنسی ٹھٹھا کیا کرتی تھی۔

قضائے کار ایک جوان طرح دار پہ ارمان نادان صورت اسی زنا۔

دل شکن کو دیکھ کر حیران و پریشان ہوا اور رسوائی اور بے حیائی کا خیال دل سے نکال کر،
وصل کا شیدائی ہوا۔ یہ جادو چشم بد خصلت بھی ویسی ہی تمنائی ہوئی۔ الغرض جب شام سیہ فام
نے سیاہی شب سے رخ خورشید کالا کیا تو وہ ذات کا تنبولی تابدان کی راہ اس زن بدخو
غفلت شعار لعنت بکار کے پاس پہنچا۔ دونوں خواب غفلت میں سرشار و مدہوش سو رہے۔

اس گوشے میں جہاں عروس وصل کی شراب چھکا چھک پیے خورسند
حال بدمست پڑے تھے۔ ادھر سے پچھلے پہر اس زن شعلہ خو کا سسرا کاندھے پر ہل دھر کر
نکلا۔ یہ احوال کثیر الاختلال دیکھ کر وہ دہقانی اس قدر غصّے سے نیلا پیلا ہو اکہ چاہا
ایک ہی بار تیغ بے باڑھ دار سے اس فاحشہ کا قصہ پاک کر ڈالے۔ پر اپنے بیٹے سے ازبسکہ
ڈرتا تھا۔ سو چپ رہا۔ لیکن اس زن بے تمیز کے پاؤں سے گھری نقرئی اتارلی کہ یہ بوقت
سحر منکر نہ ہو جائے۔ وہ تو گھری نقرئی لیکر کھیتوں کو روانہ ہوا۔ ادھر اس رشک پری کی آنکھ
کھلی۔ اپنے حال سے آگاہ ہوئی۔ ماتھا ٹھنکا کہ شکا فریب جادو کا ٹوٹ گیا۔ تنبولی زادے کو
دم دلاسے دیکر رخصت کیا۔ اور انگڑائی لیتی بے حجاب اپنے شوہر کے پاس پہنچی کہ یہ
گنہگار بخت بیکس محنت کی نیند پڑا سوتا تھا۔ بصد انداز و دلربائی شوہر کو جگا کر بولی "واہ
رے مرلش و غمخوار تیری بے رحمی نے یہ دن دکھایا کہ اب تو مجھے زینت آغوش بھی نہیں بناتا،
اور میں کونے کھدروں میں منہ چھپائے سسکیاں بھرتی پھرتی ہوں۔۔۔

یہ بانگڑو جورو بدخو کا یہ بے محابا التفات دیکھ کر جامے میں پھولے نہ
سمایا اور خوب ملتفت ہوا۔ دونوں باہم شیر و شکر ہو کر پڑ رہے۔ پھر بعد اس قتالہ نے

میاں کو جگایا، اور اپنا شمنہ دکھا کر بولی ۔ اے یار جانی! سرمایۂ زندگانی کہیں یہ شان ہے کہ جہاں جورو، خاوند خواب میں خر سند ہوں، وہاں بوڑھا سسرا بہو کی گجری اپنے ہاتھ سے اتارے جاتے۔ ایسے بد سرشت بڈھے تو گردن زدنی ہیں۔

الحاصل وہ پیر کو اس زن بے مہر کا غصّہ کھیتوں سے لوٹا، اور فرزند دلبند سے کہنے لگا کہ بد خصال نا ہنجار، بدکار عورت تیری ایسی ہے کہ ایک شخص غیر کے ساتھ خلوت گزشتہ میں اس بے فکری اور فراغت سے سوتی تھی کہ گجری اسکی میں نے اتاری اور اس کو خبر تک نہ ہوتی۔

باپ کی باتیں سن کر وہ گیدی خر مرد ادبک مرغ بے ہنگام بولا ... کہ اے بوالہوس اس بڑھاپے میں بھی تجھے بڑا عشق لگا ہے کہ بہو بیٹے سے سوانگ کرتا ہے۔ اور بہو کی پنڈلیاں چھپ چھپ تا پھرتا ہے۔ جو کبھی ایسی ناشائستہ حرکت پھر کی تو دیکھ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

زن فاحشہ نے جھٹ، بیچ بچاؤ کیا، اور میاں کو سمجھا بجھا کر ایک طرف لے گئی، اور بولی۔ "واہ! تم بھی خوب ہو تم کو بات بزرگوں سے کرنے کا شعور نہیں! گجری اتاری تھی تو خیر کونسی قیامت آگئی۔ تم کو شرمندہ کرنا کیا ضرور تھا۔

اپنی زن ذی شعور کی باتیں سن کر یہ گاؤدی بہت متاثر ہوا اور اُس شعور مند پر ایمان پہلے سے کہیں زیادہ لے آیا۔

چونکہ مرد ادبک مرغ بے ہنگام خالو جہال کے گھر میں ایک زن ذی شعور رہتی

تھی۔ اس لئے وہ محنت کی نیند سویا کرتے تھے۔ اور انہیں خبر ہی نہ تھی کہ کس کی گجری نقرئی کس کے ہاتھ میں ہے۔

واضح رہے کہ جوں جوں خالو جمال عمر میں بڑھ رہے تھے۔ خالہ فیروزہ ان کے دل کو پہلے سے زیادہ، کہیں زیادہ عزیز ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کی تنخواہ خالہ کے لئے تھی۔ گلبرگ میں نئی تعمیر شدہ کوٹھی خالہ کے نام تھی۔ دو عدد نہری مربعے خالہ کے حق میں بیع تھے۔ نئے رولز کے تحت پنشن کی وارث بھی خالہ ہی کو مقرر کیا تھا۔ پچھتر ہزار کی پالیسی حادثے یا موت کے وقوعہ کی حالت میں خالہ فیروزہ ہی کو ملنی تھی۔

لیکن خالہ کا رویہ مختلف تھا۔ انہیں خالو کے منہ سے بو آتی تھی۔ جب خالو رات کو سونے سے پہلے، اور نماز پڑھنے کے بعد، نقلی دانت اتار کر پلاسٹک کے گلاس میں رکھ کر سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی لئے خالہ کے ساتھ ڈبل بیڈ میں لیٹتے تو خالہ، بے چاری سناٹے میں آجاتیں، خالو بے چارے ان ساٹھے پاٹھے مردوں میں سے نہ تھے کہ ڈھلی دوپہر میں بھی ان کا حسن شاہِ بلوط کی طرح قد آور رہتا، وہ تو ساری زندگی ایک ہائی کلاس قسم کے کلرک رہے۔ فائلوں میں ڈوبے ہوئے۔ پی آئی اے کے مرغوں کی طرح ایک ہی گرشنے میں کھاتے پیتے پلتے رہے۔ انہیں ہرگز معلوم نہ تھا کہ دفتر کی کھڑکی سے باہر کیا کچھ ہو رہا ہے۔

دو تین بار یورپ گئے لیکن اس طور پر کہ قیام گاہ سے سیدھے دفتر اور وہاں سے واپس۔۔۔ نہ کوئی تھیٹر، نہ کوئی نائٹ کلب، نہ کوئی سیر سپاٹے، نہ کوئی مقامی

دوستیاں۔ ان کے بھانویں تو جیسے کنٹھا دیں بسے، ویسے بسے بدیں، پہلے تو خالہ کو جمال صاحب کی ان ہی باتوں سے بہت گہری محبت تھی، ان کی ایک کھونٹے سے بندھے رہنے کی خاصیت کو وہ بڑے زور و شور سے سراہا کرتی تھیں، لیکن جب یہ بیل کسی اور تھان پر جا کر چرنے کے قابل نہ رہا تو خالہ اسے ڈنڈے مار مار کر کہتیں "واہ کبھی سنا ہے کہ مرد ذات ایسی ہو۔۔۔ ابھی تو زنخنے ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مار لیتے ہیں۔ ان حضرت کو تو ہمیشہ سے عورت کو دیکھتے ہی پسینہ آجاتا ہے۔ اس میں سارا قصور شاید خالہ کا نہ تھا، کیونکہ اب وہ ایک ایسے دور سے گذر رہی تھیں جسے مینوپاز کا پرہیجان عہد کہا جاتا ہے۔ جو باتیں خالہ کے لئے پہلے قابلِ قبول تھیں اب وہ ان سے بڑی شدید نفرت کرنے لگی تھیں، جن چیزوں کا ہلکا سا چسکا تھا اب ان کا بھبس چڑھا تھا کہ عقل کی حد سے تجاوز کئے جاتی تھیں۔

دراصل سارا فتور لہو کا ہے۔

اس گھر کا لہو بگڑ چکا تھا۔ اس میں انٹی باڈیز شامل ہو چکی تھیں، جسطرح ایک نوزائیدہ بچہ جسکا آر ایچ فیکٹر مثبت نکل آئے، تو عموماً وہ جانڈس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کا لہو تبدیل نہ کیا جائے تو یہی آر ایچ فیکٹر، اسکے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس گھر کا آر ایچ فیکٹر بگڑ چکا تھا، اور سارے گھر کو ساون کے اندھے کی طرح ہر جگہ سبز ہی سبز نظر آتا تھا۔۔۔

بیچارے خالہ کا قصور تو تب ہوتا اگر وہ نوجوان ہوتیں، اور پھر خالو سے محبت

نہ کرتیں!

محبت کی بات تو کوئی ان دنوں ظفر سے کرتا۔ اسے اندر باہر، ارد گرد بس ایک
ہی چیز نظر آتی تھی اور وہ تھی محبت! ننی رشی رشیدہ کو خط لکھنے کے بعد ظفر نے زبان سے
لفافے کی گوندیلی گی، اور جب تو جلال تو پڑھتا لفافے کو بند کرنے لگا۔ لفافہ بند کرنے کے
بعد اس نے محبت سے اس پر رشو کا پتہ لکھا۔ اور اسے مذاہب عالم کی اس ضخیم کتاب
میں رکھ دیا جو اسے آپا جی نے عاریتاً دی تھی۔

شام پڑ رہی تھی آج کو ٹھے پر آپا جی نہ تھے۔ ایسی سکون کی گھڑیاں اس گھر میں کم
آتی تھیں، دوسری منزل میں کوئی بچہ منہ کھولے اونچے اونچے رو رہا تھا، ظفر کھڑکی میں
کھڑا ہو گیا۔ نیچے کھلونے جیسی کاریں آ جا رہی تھیں۔ شہر کی آبادی اینٹوں میں محبوس متحرک
اور ہڑپے کے کھنڈروں کی طرح بے جان نظر آتی تھی۔ ظفر اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر شہر
تماشا دیکھنے کا شوقین تھا۔ اس بازیچۂ اطفال میں کھو کر وہ اپنی بے بضاعتی کو پرکھتا!
کے آپا جی شلز سے اتر آتے، یہاں سے وہ اس موذن کی آواز سن سکتا تھا جو ہر اذ
سے پہلے، مائیکروفون پر اذان دینے سے پہلے چند ایک گھریلو قسم کی باتیں کر لیا کرتا تھا
اور جسے شاید یہ علم نہ تھا کہ جہاں مائیکروفون اذان کو ہوا کے دوش پر اچھالتا ہے وہاں
"وہ چاول پک گئے ہیں، کا کا کہاں ہے۔ مولیاں گرشت پکالو" قسم کی باتیں بھی اونچی
کے لوگوں کے کانوں تک پہنچا سکتا ہے۔

مظفر بھائی کار لے کر اپنی دوکان پر جا رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔ رکھیں گے جی۔

کسی دن . . غروب آفتاب کے قریب۔ اظہر غالباً کہیں کرکٹ کھیلنے جا چکا تھا۔ ابا جی بی ایس آر کا کوئی لیکچر سننے گئے ہوئے تھے۔ . . . . اس وقت ظفر اکیلا تھا۔ یہ بہاولپور کی لڑکی کیسی ہے؟ . . . ظاہر ہے اچھی ہے۔ یہاں پہ کیوں آئی ہے؟ . . . تمہارا قرار لوٹنے . . . احمق! کیا یہ میرے متعلق کبھی سوچتی ہے؟ وہ کیوں سوچے گی؟ ایسی بھیگی بلیوں کو ان کاموں کی فرصت نہیں ہوا کرتی۔

ابھی وہ ان ہی باتوں کے متعلق عجیب ضروری سوال و جواب کا کھاتہ بھر رہا تھا کہ بیرونی سیڑھیوں پر کھٹکا ہوا۔ ابا جی کبھی اندر والی سیڑھیوں سے اوپر نہیں آتے تھے! ظفر نے جلدی سے "دنیا کے عظیم مذاہب" کھولی اور پڑھنے لگا۔ اس کی نظروں کے سامنے بدھ کے سٹرپا پھیلے تھے۔ کانوں میں نہ جانے کب کے پڑھے ہوئے الفاظ گونجنے لگے . . . . .

محبت سے دکھ کی چتا جلتی ہے۔
محبت سے خوف کا دیا جلتا ہے
جسنے محبت سے چھٹکارا حاصل کر لیا
وہ نہ دکھ سے ڈرتا ہے نہ خوف سے

کسی نے اس کے دروازے پر مدھم سی دستک دی۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں۔ غازی۔"

"ہا ہا . . . آجاؤ ! یار ! میں بہت بور ہو رہا تھا ۔ آجاؤ . . ."

غازی چپ چاپ اندر آکر پلنگ پر بیٹھ گیا ۔

"میں یہ کتاب دیکھ رہا تھا ۔ غازی یہ دیکھو ! سدھارتھ ، کپل وستو کا شہزادہ کیسے یونانی لگتا ہے ۔ ہے نا . . ؟"

غازی خاموش رہا ۔

"میں سوچ رہا تھا ۔ ہر بڑا آدمی ، ہر مہاتما ، پہلے احساسِ کمتری میں سلگتا ہے پھر اس جگہ پہنچتا ہے جہاں سے وہ دوسروں کے احساسِ کمتری دور کر سکے ۔ سدھارتھ کپل وستو کے اس شہزادے کو بھلا کس چیز کی کمی تھی . . ."

غازی اب بھی چپ تھا ۔

"بدھ نے گیا کے درخت تلے نروان حاصل کیا اور بولا :

محبت سے دکھ کی چتا جلتی ہے

محبت سے خوف کا دیا جلتا ہے ۔

جس نے محبت سے چھٹکارا حاصل کر لیا

وہ نہ دکھ سے ڈرتا ہے نہ خوف سے

. . . سن رہے ہو ؟"

غازی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی ۔

"یار ! وہ نہیں مانتی ۔"

"کون نہیں مانتی ؟" ظفر نے آہستہ سے پوچھا۔

"وہ نکھی بسیوا کی بچی۔"

"اچھا۔ گلنار کی بات کر رہے ہو؟"

"اور ہم کس کی بات کریں گے۔" غازی نے گیا کے بدھ کی طرح کہا۔

"کیا نہیں مانتی ؟"

"میں نے اس سے کہا تھا۔ تم پیشہ چھوڑ دو، ہم کراچی چلے جائیں گے۔"

"تمہارے ابّا جی مان گئے ہیں ؟ غازی!"

"ابّا جی! ابّا جی ! . . ." وہ دیر تک ابّا جی، ابّا جی کہتا رہا۔

غازی کے ابّا جھنگ کے بہت بڑے زمیندار تھے، ان کی جاگیر قریباً ساٹھ مربعوں پر مشتمل تھی جو زرعی اصلاحات ہونے کے بعد انہوں نے گھر کے مختلف افراد کے نام بیع کر کے مختار نامے عام اور خاص، حاصل کر لئے تھے، اس زمین کے شکمی اجارہ داروں کی فہرست اتنی طویل تھی کہ شاید ان کے رجسٹر میں بھی درج نہ تھی۔ وہ دروغ حلفی اٹھانے کے ماہر، وعدے زائد المیعاد کے مقدموں کی پیروی میں گرفتار، اشتمالات میں دخلکاری کے ماہر، جھوٹے تملیک ناموں کے پیچھے مرنے والوں، مزارعوں کی تقاوی کو ترکہ پدری سمجھنے والے تعزیرات ہند کے حافظ تھے۔ ان کا سارا وقت ایسے کھیڑوں میں گذرتا تھا کہ تین نوجوان لڑکے جو بن ماں کے بچے بھی تھے، اپنے اپنے حالوں مست تھے اور ابّا جی کو علم بھی نہ تھا کہ ایک کا نام بستہ بے میں لکھا جا چکا ہے۔ دوسرا زمینداری

کی جگہ نوجوان دوشیزاؤں کا عاشق ہے ۔ اور نغیرا جسے سدھارنے کے خیال سے انہوں نے لاہور بھیج دیا ، گلنار کے نام کا دیپ جلائے بیٹھا ہے ۔ پہلی بار جب گلنار کا بھوت غازی پر شدت سے سوار ہوا تو وہ سر پر کفن باندھے گاؤں پہنچا ۔ رات تک ابا جی بیلے میں بیٹھے چاچا کرم داد اور کالو مراثی سے قانونِ استقرائی کی باتیں کرتے رہے ۔ غازی نے کئی چکر لگائے لیکن چاچا جی ایک سانس میں بولتے تھے ، سانس اکھڑ اکھڑ جاتا لیکن بات کا تانا بانا نہ ٹوٹتا ۔ ہر بار جب وہ پاس آتا تو وہ کرم داد سے کہتے ۔

”دیکھ لے ، کمی کمین کی اولاد اور اصل اشرافوں کی اولاد میں یہ فرق ہوتا ہے ۔ بی اے کر رہا ہے ، غازی ہمارا . . . بی اے ۔“

جس قدر زیادہ وہ تعریف کئے جاتے تھے اسی قدر غازی کا کنٹھا بیٹھتا جاتا تھا ۔

”میری تو تمنا تھی کہ یہ وکالت کرے ، لیکن خیر جو جوڈیشل فیصلہ اس نے کر دیا ، کر دیا ۔“

چاچا کرم داد نے حسرت بھری نظروں سے غازی کی جانب دیکھا ۔ ان کی اولاد سیدھی سادھی دیہاتی تھی ، پانچ لڑکے اور تین لڑکیوں میں سے ایک نے بھی کبھی شہر کا رخ نہ کیا تھا . .

لڑکے بڑے محنتی اور نلائی گوڈی کے شوقین تھے ۔ سہاگہ پھیرنے اور غلہ گاہنے کے علاوہ انہیں کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی ، گھر میں کوٹھے کے کوٹھے دانوں سے بھرے تھے ، لیکن چاچا کرم داد کو نیاز محمد ، اپنے بھائی کی اولاد پسند تھی ۔ اٹھتے

بیٹھتے کہتے۔

"ہمارا گھر تو بے نصیب ہے۔ بھائی نیاز محمدؒ کی اولاد کو ذرا دیکھو۔ بڑا لڑکا لائل پور میں نوکر ہے۔ دوسرا بی اے کر چکا ہے۔ اور اب غازی کو دیکھ لو، لاہور میں بی اے کر رہا ہے۔ بی اے، اور ایک یہ پانچ لونٹھے ہیں، اپنا خط بھی نہیں لکھ سکتے!"

جب کالو مراثی چاچا کی ٹانگیں خوب دبا چکا اور حقہ کے مچھول ٹھنڈے ہو گئے تو چاچا کرم داد آہیں بھرتا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ کھلی چارپائی پر صرف تہمد باندھے، پگڑی کا سرہانہ بنائے نیاز محمدؒ کچھ سویا اور کچھ جاگا ہوا تھا کہ غازی نے آگے بڑھ کر ہمت سے کہا۔

"ابا جی، ایک بات ہے . . . آپ سے۔"

"کرو کرو . . . کرو کرو۔"

"وہ جی میں شادی کرنا چاہتا ہوں . . ."

"شادی؟ شادی؟ . . ." ابا جی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے، اور غازی کو غصہ سے ہونے لگا، جیسے وہ اپنی ٹانگوں پر نہیں بلکہ چارپائی کے پایوں پر کھڑا ہے۔

"وہ جی . . . ایک لڑکی مجھے پسند آگئی ہے شہر میں۔"

"شہر میں . . . لڑکی . . ؟"

گلنار سے محبت کا جوش تھا جو اُبل اُبل کر باہر نکل رہا تھا۔